Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:2 (1968)

تصورِ تعلیم
قرآن کی روشنی میں

پروفیسر شیخ محمد عثمان

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنے کی کوشش کروں گا کہ قرآن سے روشنی حاصل کرنے کا ہمارا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ یا کم از کم میرے نزدیک وہ طریقہ کیا ہے۔ قرآن مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بنیادی دستور ہے۔ جاننے کی بات یہ ہے کہ اس میں عقائد و اخلاق کے اوامر و نواہی تو بہ تفصیل بیان ہوئے ہیں، لیکن زمانے اور وقت کے ساتھ بدلنے والے اُمورِ زندگی کے بارے میں قرآن نے ہماری رہنمائی بہ تفصیل اور جُزرسی کے ساتھ نہیں بلکہ اجمال کے ساتھ کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک سیاسی یا معاشی تنظیم کا تعلق ہے، اس کے لئے مفصّل ہدایت نہیں بلکہ زیادہ تر سمت کی نشان دہی فرمائی گئی ہے۔

دوسری بات جو غالباً پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے، یہ ہے کہ جن اُمور کے لئے فقط اصولی رہنمائی پر اکتفا کیا گیا ہے، ان کی بنیاد یا سمت تو ہمیں کتاب و سنّت سے میسّر آئے گی لیکن اس بنیاد پر عمارت تعمیر کرتے وقت یا اُس سمت میں جادہ پیمائی کے سمے ہمیں ان حقائق کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جو زمانے کی ترقی و ارتقاء کے ساتھ مسلّمات اور آفاقی سچائیوں کا درجہ حاصل کر چکے ہوں اور قرآنی تعلیمات کی روح کے منافی نہ ہوں۔

مثال کے طور پر رسمِ غلامی کو لیجئے۔ قرآن نے غلامی کو بہ یک جنبشِ قلم منسوخ نہیں کیا تھا لیکن غلام کے آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دے کر، خطاؤں اور لغزشوں کے کفارے میں غلاموں کی رہائی کا مطالبہ کر کے، غلاموں کے ساتھ حسنِ اخلاق پر زور دے کر اور اُمورِ دین میں آزاد اور غلام

---

۱ جشنِ نزولِ قرآن کے سلسلے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس لاہور کے زیرِ اہتمام ایک مذاکرہ میں پڑھا گیا۔

میں مساوات کا اُصول قائم کر کے ہمیں ایک ایسا روّیہ اور ایک ایسی سمت عطا کر دی تھی جس کی بدولت ہماری تاریخ میں غلام بادشاہ ہوئے، سپہ سالار بنے اور انہوں نے معاشرے میں بڑی سے بڑی عزّت و منزلت حاصل کی۔ تاہم غلامی کی رسم ہمارے ہاں نزول قرآن کے صدیوں بعد تک جاری رہی تا آنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ انسان کا ضمیر، کیا مغرب میں اور کیا مشرق میں، اس رسم کی انسانیت کُشی کے خلاف اُٹھ کھڑا ہُوا اور اس نے اسے قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔ اب دنیا بھر کے قانون کی نظر میں کسی انسان کو غلام بنانا اور غلام رکھنا ایک سنگین جرم ہے اور انسانی ضمیر کی اس عالم گیر بیداری میں ہم بھی شریک ہیں۔ ہم نے بھی اس سچائی کو قبول و اختیار کر لیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نظامِ تعلیم یا تصورِ تعلیم مفصّل ھدایت کی ذیل میں آتا ہے یا مجمل رہنمائی میں؟۔ دوسرے لفظوں میں کیا نظامِ تعلیم زمانے اور وقت کے ساتھ بدلنے والا معاشرتی معاملہ ہے یا اس کے اصول و مبادی اور جزئیات اٹل اور غیر متبدل قوانین و احکام کی صورت میں بہ تمام و کمال قرآن حکیم میں موجود ہیں؟۔

میرا جواب یہ ہے (اور یہ جواب میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے لئے دے رہا ہوں) کہ مقاصدِ تعلیم کے ایک حصے کے لئے تو قرآن سے ہمیں مفصل ھدایت ملتی ہے اور دوسرے حصے کے لئے ہمیں اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر زمانے کی ضرورتوں اور اپنے تقاضوں کا خود تعین کرنا ہو گا۔ اور اس کوشش و کاوش کے نتیجے میں جو تعلیم کا مجموعی تصوّر اُبھرے گا اور جو نظام ترتیب پائے گا، میں اُسے قرآن کی روشنی میں ترتیب شدہ نظام قرار دوں گا۔ آیئے ہم اس مسئلے کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں ـــــ مقاصدِ تعلیم کو تین بنیادی حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

اوّل:۔ نوجوانوں کو ان کے ذوق اور اہلیت کے مطابق مختلف پیشوں اور فنی مہارتوں کے لئے تیار کرنا تاکہ وہ اپنی معاش کے علاوہ معاشرے کی ضرورتوں اور فلاح و ترقی کے عوامی منصوبوں کی تکمیل کر سکیں۔

دوم:۔ پیشہ ورانہ مہارتوں اور استعدادوں کے ساتھ ساتھ ان میں اعلیٰ انسانی صفات اُبھارنا اور ان کو عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے میں مدد دینا۔ اور

سوم:۔ ان کے جذبات اور ذوقِ جمال اور ثقافتی میلانات کی موزوں تربیت کرنا یا اس تربیت

کے مواقع بہم پہنچانا۔

پہلے حصّے کے مقاصد یوں تو صدیوں پُرانے ہیں لیکن اُن کا گہرا شعور اور ان کی باقاعدہ تنظیم جدید دَور کی پیداوار ہے۔ ڈاکٹر، انجنیئر، سائنس دان، معلّم اور مختلف نوع کے کاریگر پہلے بھی ہوتے تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت کا ایسا باقاعدہ انتظام جیسا اب کالجوں، یونیورسٹیوں اور تربیتی اداروں میں ہوتا ہے، اور ان کی ضرورت و اہمیت کا وہ علم جو جدید تہذیب کا لازمہ ہے، اس سے قبل ناپید تھا۔ یہ دَور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دَور ہے۔ وسیع صنعت و حرفت اور وسیع تر تجارت کا زمانہ ہے۔ آج کے دَور میں زندہ رہنے، ترقی کرنے اور عزّت پانے کے ذرائع اگرچہ بنیادی طور پر عہدِ وسطیٰ سے مختلف نہیں، تاہم ان کے پھیلاؤ اور قوّت کا جو عالم اب ہے، وہ تاریخ کے کسی پہلے دَور کو نصیب نہیں تھا۔ بہتر ہتھیاروں کی تیاری، زیادہ مفید علوم میں دسترس اور صنعت و حرفت میں فروغ پہلے بھی افراد اور اقوام کو ممتاز کرتا تھا اور اب بھی، لیکن اب علوم کی وسعت اور ہتھیار اور سامانِ حرب تیار کرنے کی صلاحیت اور صنعت و حرفت کے پیمانے ناقابلِ یقین حد تک بڑھ گئے ہیں۔ آج کا ذہن منصوبہ بند ذہن ہے۔ ہر قوم مستقبل میں پانچ پانچ دس دس سال نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مدّت کو سامنے رکھ کر قومی ضروریات کا اندازہ لگاتی اور اس کے مطابق اپنے ہاں ڈاکٹر، انجنیئر، محقق، سائنس دان، ماہرینِ معاشیات اور دیگر کاری گر تربیت دینے کی کوشش کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے ہمیں احوالِ زندگی پر بصیرت کے ساتھ غور کرنے اور علم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس نے دشمن کے مقابلے میں ضرورت کے مطابق مسلّح رہنے، لوہے سے فائدہ اُٹھانے اور اللہ کا فضل تلاش کرنے یعنی معاش کو بہتر بنانے کا حکم دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اگر ہم عہدِ جدید کی سچائیوں میں تلاش کریں تو ہمیں مقاصدِ تعلیم یا تصوّرِ تعلیم کے پہلے حصّے کا سراغ مل جائے گا جس کے معانی یہ ہوں گے کہ ہمیں اپنے ماہرین اور اپنے کاری گر اور اپنے محقق اور اپنے سائنس دان، اپنی ضرورت اور اپنے مقاصد کے مطابق پیدا کرنے ہیں۔ جس درجے کے جتنے ماہرین یا کاریگر ہمیں درکار ہوں گے، اُسی قدر تربیت یافتہ افراد پیدا کرنا ہماری تعلیم کے ذمّے ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضروریات کو بہ طریقِ احسن پورا کرنا ہمارے تصوّرِ تعلیم کا پہلا جزو قرار

دیا جانا چاہیئے۔

(۲)

اکثر صورتوں میں علم وفن کی تربیت اور کسی پیشے کی باقاعدہ مہارت کردار کی تشکیل کا بذاتِ خود ایک معقول ذریعہ ہوتی ہے۔ تاہم اعلیٰ انسانی صفات کا اُبھارنا پیشے اور فن کی تربیت کے علاوہ بھی تعلیم کا ایک نہایت اہم فریضہ رہا ہے اور ہونا چاہیئے۔ بالخصوص اگر کوئی نظامِ تعلیم قرآن حکیم کی روشنی میں ترتیب پائے گا تو اسے اس کردار کو عام کرنے کا ضامن ہونا چاہیئے جو قرآن حکیم کی تعلیمات کی غایت ہے۔

قرآن کا انسان یا مسلمان انسانیت کی اعلیٰ صفات سے متصف ہے۔ اس میں حق پرستی، انصاف پسندی، دوسرے انسانوں کے ساتھ مساوات کا جذبہ، بہادری، بے خوفی، ایثار، دیانت، خدا کی محبت اور عبادت کا شوق، قرآن کی تلاوت اور تعلیم سے تاثر قبول کرنے کی صلاحیت اور نیکی اور خیر کو عام کرنے کی اہلیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اُسے ظلم، زیادتی، بے انصافی، عدم مساوات، استحصال اور جبر سے فطری نفرت ہے اور ان معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کو وہ اپنے لئے سب سے بڑی سعادت اور راہِ خدا میں سب سے بڑی نیکی خیال کرتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں اور اس کے ثقافتی میلانات زندگی کو آگے بڑھانے اور اسے خوب صورت اور توانا بنانے میں صرف ہوتی ہیں۔ وہ علم وبصیرت کا شیدائی اور معرفتِ حقائق کا علم بردار ہے۔ وہ تنگ نظری اور کم حوصلگی کے مقابلے میں وسعتِ نظر، عالی ظرفی اور بلند ہمتی کا حامل اور دوست ہے۔

اس فہرست کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں مزید جامع ومانع بنایا جا سکتا ہے لیکن میرا مقصد یہاں مسلمان یا قرآن کے انسان کی صفات واقدار پر مفصل بحث کرنا نہیں بلکہ اس کی طرف مجمل اشارہ کرنے کے بعد یہ بتانا ہے کہ نئی نسل میں ایسے کردار کی تشکیل اور اس کی حوصلہ افزائی ہمارے تصورِ تعلیم کا دوسرا اہم جزو ہونا چاہیئے اور پھر یہ سوال اُٹھانا ہے کہ ایسے کردار کی تشکیل واشاعت ہمارے نظامِ تعلیم کے ذریعے کیسے ممکن بنائی جا سکتی ہے۔

تعلیم کا عمل اور بالخصوص اس کا وہ حصہ جو تعمیرِ کردار سے تعلق رکھتا ہے، سکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی چار دیواریوں میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس عمل پر تین عناصر کو مشترک

گرفت حاصل ہے: اوّل معاشرہ، دوم اُستاد کی شخصیت اور سوم کتاب اور اس کے مشمولات۔

استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر آپ ایک ایسے معاشرے میں جس میں انصاف، مساوات یا ایثار کا دور دورہ نہ ہو، محض تعلیم کے ذریعے نئی نسل کو انصاف پسند، مساوات پرور اور ایثار پیشہ نہیں بنا سکتے۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں رشوت، چور بازاری، کاروباری بد دیانتی یا معاشی لوٹ کھسوٹ عام ہو، اس کا نظامِ تعلیم خواہ اس کی نصابی کتابیں ساتویں آسمان سے چھپ کر آئی ہوں اور ان کو پڑھانے کے لئے فرشتوں کا تقرر عمل میں لایا گیا ہو، بد دیانتی اور ناجائز ذرائع دولت سے دامن بچانے والے اور معاشی لحاظ سے انصاف پسند نوجوانوں کی کھیپ تیار نہیں کر سکتا۔

معاشرے کے بعد اُستاد کی شخصیت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس ضمن میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ معاشرے میں چلنے والے جھکڑ اور اُٹھنے والی آندھیاں لامحالہ اُستاد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہیں اس لئے کہ اُستاد اور جو کچھ بھی ہو، معاشرے کا ایک رکن بھی تو ہوتا ہے، لہٰذا معاشرے کو تعلیم کے حقیقی مقاصد سے قریب تر لائے بغیر غالباً اُستاد کو بھی تعلیم کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے ہاں تعلیم کے مسائل پر غور کرنے والوں کی میری نظر میں ایک کوتاہی یہ ہے کہ وہ تعمیرِ کردار کے سوال کو متذکرہ مثلث کے کتاب و نصاب والے کونے سے اُٹھا کر اوّل تو اس پر یا پھر زیادہ سے زیادہ اُستاد کی شخصیت پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں اور اس تک بھی اکثر بے دلی اور ایک گونہ تھکن کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کے تصورِ تعلیم کو سمجھنا اور اپنانا چاہتے ہیں اور اُس کردار کی جھلک اپنے آس پاس دیکھنے کے واقعی متمنی ہیں جسے قرآن پسند کرتا ہے تو ہمیں معاشرے اور تعلیم کے باہمی تعلق پر زیادہ غور کرنا ہوگا اور معاشرے میں اُستاد کی حیثیت پر بھی، بالخصوص پیشۂ معلمی کے معاشی اور اس کے علمی و تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کے پہلوؤں سے۔

اور اب میں کتاب و نصاب کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ اس ضمن میں پہلی بات مجھے یہ کہنی ہے کہ تعمیرِ کردار و جذبات کے نقطۂ نظر سے بعض مضامین اور ان کی تدریس کم اہم یا غیر اہم ہے اور بعض مضامین اور ان کی تدریس زیادہ یا نہایت اہم ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم

اپنے تصورِ تعلیم کو واضح طور سے سمجھنے کے لئے اس فرق کو نہ صرف نظری طور سے جانیں بلکہ عملی طور سے اسے رائج بھی کریں۔ سائنس کے جملہ علوم مثلاً کیمیا، طبیعیات، ریاضی، حیاتیات وغیرہ اور کچھ معاشرتی علوم مثل معاشیات، فلسفہ اور سیاسیات، یہ علوم اگرچہ بعض صورتوں میں کردار کی تشکیل میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن بالعموم ان کی تدریس کا مقصد طلبہ میں معلومات، ذہنی مستعدی اور عملی مہارت فراہم کرنا ہے۔ اس کے برعکس بعض علوم ایسے ہیں جن کی تدریس علم افزائی اور ذہنی مستعدی کے ساتھ ساتھ متعلم کے کردار کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے اور اس کے جذبات کی تہذیب کرنے کے بے پناہ امکانات اپنے اندر رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ علوم تین ہو سکتے ہیں: اوّل تاریخ بالخصوص اسلامی تاریخ، دوم اسلامیات اور سوم اُردو اور بنگلہ۔ اگر ہم تعلیم میں کردار سازی کے مقاصد میں سنجیدہ ہیں تو ہمیں ان تین علوم کی نصابی کتابوں کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر انہیں پھر سے ترتیب دینا ہوگا۔ اور اگر ہو سکے تو ان مضامین کو باہم منسلک کر کے ایک نئی فیکلٹی تشکیل کرنا ہوگی۔ اس سمت میں ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اُردو کے نصاب کو فرسودہ قسم کی ادبیت سے، اسلامیات کو از کار رفتہ طرزِ تدوین سے اور تاریخ کی تدریس کو بے مقصدیت کے چنگل سے آزاد کرائیں اور انہیں زندگی اور ملّی مقاصد کی کھلی، تازہ اور روشن فضا سے آشنا کریں۔

اس وقت نئی نسل اور قرآن کے اخلاقی و ثقافتی قدروں کے درمیان ہمارے طرزِ تدریس اور نصاب کی دیوار حائل ہے۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ ہم قومی تاریخ، اسلام اور قومی ادب پر ایسی لاتعداد کتابیں مہیا کریں جو بہ یک وقت حقائق افروز اور خیال انگیز ہوں اور جو اس قابل ہوں کہ نئی نسل کے ذہنوں اور دلوں کو برما سکیں، اپنی طرف کھینچ سکیں، اپنے اندر جذب کر سکیں۔

معاشرے کی تبدیلی کے بعد اگر کوئی نسخہ ہمارے کردار سازی میں کارگر ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ دوسری کامیاب قوموں نے اس راہ پر چل کر ترقی کی ہے اور ہم اگر نیک نیت ہوں تو ہمیں بھی اسی راہ پر چلنا ہوگا۔ یہ راہ کٹھن اور دشوار گزار ضرور ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں اچھی کتاب کی تخلیق قریب قریب ناپید ہو چکی ہے۔ تاہم منزل تک پہنچنے کا راستہ فقط یہی ہے۔ اپنی ضرورت اور اپنی طلب کے مطابق جو قوم کتاب پیدا نہیں کر سکتی، قوموں کی برادری میں معزز نہیں ہو سکتی۔

اس مرحلے پر میں یہ نہیں کہتا کہ ہم بین الاقوامی علوم کے میدان میں کتاب پیدا کریں لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے قومی علم کے میدان میں اپنی نئی نسل کو اپنی کتاب مہیا کریں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن کی روشنی میں تصورِ تعلیم کا دوسرا جزو یہ ہے کہ ہم قومی علم کے ابلاغ و اشاعت میں خود کفیل ہوں اور ہماری نئی نسل کو سیرتِ رسالت مآبؐ کے لئے مانٹ گمری واٹ کا اور حیاتِ قائداعظمؒ کے لئے ہیکٹر بلیتھو کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ ہمارے بارے میں دوسرے کتابیں نہ لکھیں، مقصود یہ ہے کہ اپنے بارے میں ہم خود اگر دوسروں سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر تو لکھ سکھیں اور اپنی نئی نسل کو اپنا نقطۂ نظر دینے کے قابل ہوں۔ جو نظریۂ حیات اپنی نئی نسل تک نہیں پہنچتا، اس کے مستقبل کے بارے میں دو رائیں قائم نہیں کی جا سکتیں۔

(۳)

مقاصدِ تعلیم کا تیسرا حصہ زیادہ تر دوسرے سے متعلق ہے۔ کردار کی تشکیل جذبات اور ذوق کی تربیت کے بغیر بالعموم ممکن نہیں، تاہم ثقافتی میلانات کا مسئلہ بہت سی دوسری اقوام کی طرح ہمارے ہاں بھی خصوصی توجہ کا طلب گار ہے۔ اس لئے کہ ترقی پذیر اور صنعت کی طرف تیزی سے بڑھنے والی اقوام کو اپنے ثقافتی مزاج پر بہ طورِ خاص نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ ایسی قومیں مغرب کی طاقت ور مگر ثقافتی اعتبار سے زوال آمادہ اقوام کا پھر سے شکار نہ ہو جائیں۔

قرآن حکیم کسی بھی فنِ لطیف پر اس کا نام لے کر کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ اس نے شاعری، موسیقی، رقص، ڈرامہ، مجسمہ تراشی اور مصوری میں سے کسی تخلیقی فن کو بے کار یا مضرت رساں لہٰذا ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس کی رہنمائی کسی مخصوص فن یا مہارت یا سرگرمی کی بجائے زندگی اور ثقافت کے بارے میں مجملاً یہ ہے کہ جو عمل، جو سرگرمی، بے حیائی اور سماجی انتشار کا باعث ہو اور سفلی جذبات کو انگیخت کرے، بُری ہے اور ہمیں اس سے بچنا چاہیئے۔ ورنہ ہر وہ عمل جو انسان کی تسکین و تفریح یا اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی تکمیل اور اس کی شخصیت کے استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے، قرآن کی نظر میں ہرگز غیر مستحسن نہیں ہے؟

ثقافتی سرگرمیوں کے ضمن میں ہمارے تعلیمی حلقوں میں خاصا انتشار پایا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے اس اصول و معیار کی رُو سے ہم خود اعتمادی اور جرأت سے کام لے کر تعلیم اور ثقافت کے تعلق کو واضح طور پر سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔

آخر میں مَیں یہ عرض کروں گا کہ جو علوم بین الاقوامی ہیں، جہاں تک ان کی تدریس کا تعلق ہے، ہمیں دوسری اقوام کے دوش بدوش چلنا چاہیئے اور ان کے معیار کو انہی کے اسلوب اور تیکنک کے ساتھ اپنانے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن وہ علوم جو ہمارے ساتھ خاص ہیں، جو صرف ہمارے ہیں، جن کی تدریس ہمارے نظریۂ حیات، ہمارے اصولِ اخلاق اور ہمارے ثقافتی مزاج سے تعلق رکھتی ہے، ان میں ہمیں دوسروں کا مقلّد یا دستِ نگر ہونا زیب نہیں دیتا۔ توحید کا اُصول نئی نسل کے دلوں میں کس طرح راسخ کیا جائے، اس کا اسلوب ہمیں خود پیدا کرنا چاہیئے۔ اس میں واشنگٹن، لندن یا ماسکو ہماری رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہمیں کسی کی رہنمائی کا محتاج ہونا چاہیئے۔

بس اس فرق کو ملحوظ رکھنا اور اپنانا میرے نزدیک قرآن کی روشنی میں تصورِ تعلیم کا لُبِّ لباب ہے۔